

ثورہ الحسین (علیہ السلام) اور اس کے فلسفیانہ پہلو

پیش

حق سربلند

مزید تحقیقات کے لیے فائلو کریں ہمارا چینل

<https://whatsapp.com/channel/۰۰۲۹VbBZkQrADTO۹tqp۵XV۱A/۳۳۱>

قبل اس کے کہ ہم ثورہ الحسین (امام حسین علیہ السلام کے انقلاب) اور اس کے فلسفیانہ پہلو پر تحقیق کا آغاز کریں، ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ امام حسین (علیہ السلام) کون ہیں؟ اور وہ قائدانہ کردار کیا ہے جو آپ کی شخصیت کا عکاس اور ضامن ہے؟

جہاں تک امام حسین (علیہ السلام) کی شخصیت کا تعلق ہے، تو اسے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ فرمان گرامی بہترین انداز میں پیش کرتا ہے: ”حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں“۔ یہ حدیث نبوت اور امامت کے راستوں کے درمیان ایک ایسے نورانی وجودی اتحاد کی عکاسی کرتی ہے جو لامتناہی یکجائی کی شکل میں ہے، نہ کہ محض دو الگ الگ نورانیوں کے باہم جڑنے کی۔ جیسا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا یہ فرمان بھی اس بات کو ثابت کرتا ہے: ”حسن اور حسین دونوں امام ہیں، خواہ وہ قیام کریں یا بیٹھے رہیں (صلاح کر لیں)“۔

کیونکہ امت کو اپنے مذہبی، علمی، سماجی، سیاسی، معاشی اور نفسیاتی سفر میں ایک ایسے قائد کی ضرورت ہوتی ہے جو اپنے تمام تر پہلوؤں اور محوروں کے ساتھ نبوت کی شخصیت کے کردار پر پورا اترتا ہو۔ اسی بنیاد پر امامت کا منصب امام کی شخصیت میں منحصر ہوتا ہے، جس کا اعتراف سنت نبوی سے ثابت اور نص قرآنی سے منصوص ہے۔ اسی لیے امام حسین (علیہ السلام) اپنے ذاتی استحقاق کی بنا پر طہارت و عصمت کبریٰ کے اس دائرے میں شامل ہیں جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس فرمان میں فرمایا ہے:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (الاحزاب: ۳۳)

اللہ تو یہی چاہتا ہے اے نبی کے اہل بیت! کہ تم سے ہر قسم کی آلودگی کو دور رکھے اور تمہیں خوب پاک و پاکیزہ بنادے۔

یہ آیت اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ قائد کی شخصیت کا باطنی طہارت، پاکیزگی اور تقدس سے آراستہ ہونا لازم ہے تاکہ وہ امت کی عمومی قیادت کا اہل بن سکے۔ اگر وہ ان صفات سے محروم ہو، تو جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمانِ عالی شان دلالت کرتا ہے:

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ (البقرہ: ۱۷۴)

میرا یہ عہدہ (امامت) ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔

ایسی صورت میں وہ شخص غلطی، شبہ اور خرابی کا شکار ہو سکتا ہے، جس کی وجہ سے اس کا قول دوسروں کے لیے حجت (دلیل) نہیں رہے گا، کیونکہ وہ مرتبے میں عام فرد اور معاشرے سے بھی نیچے گر جائے گا، اور ایسا شخص دینی قیادت کے لائق نہیں ہوتا۔

اس مختصر سے تعارف کے بعد، اب ہم اس تحقیق کے اصل موضوع کو پیش کرتے ہیں جو امام حسین (علیہ السلام) کے انقلاب کے علمی، نفسیاتی، ثقافتی، فلسفیانہ، سیاسی اور سماجی پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ ان پہلوؤں کو چند چیدہ چیدہ نکات کی صورت میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

پہلا پہلو: اصلاح احوال کے لیے قیام کرنا ہے، جیسا کہ خود امام علیہ السلام نے اپنے اس بیان میں واضح فرمایا: ”میں کسی سرکشی، تکبر، فساد یا ظلم کے لیے نہیں نکلا، بلکہ میں صرف اپنے نانا کی امت کی اصلاح کی خاطر، اور امر بالمعروف (نیکی کا حکم دینے) اور نہی عن المنکر (برائی سے روکنے) کے لیے نکلا ہوں۔“

یہ فرمان ہر اس مصلح (اصلاح کرنے والے) کے راستے کو آشکار کرتا ہے جو معاشرے میں ظلم، ناانصافی، فساد، افراتفری، عدم استحکام، کتاب و سنت کے منافی نئی قانون سازی، انسانی وقار کی پامالی، حقوق سلب کیے جانے اور ایک ایسی عادلانہ حکومت کے فقدان کا سامنا کرتا ہے جو انسانی وجود کا تحفظ کرے اور معاشرے کے طبقوں میں اقدار کا دفاع کرے۔ چنانچہ ایسے حالات میں، جس شخص میں بھی صلاحیت اور اہلیت ہو، اس پر عقل کی حاکمیت کو برقرار رکھنے کے لیے اصلاحی قیام کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

دوسرا پہلو: آزادی کی ترویج و اشاعت ہے، اور اس کی تصدیق امام علیہ السلام کا یہ فرمان کرتا ہے: ”اپنی دنیا میں آزاد منش ہو جاؤ۔“ یہاں آزادی کا موضوع اپنے تمام تر ابعاد و پہلوؤں کے ساتھ انسانی فطرت اور اس کی جبلت کے عین مطابق ہے، جو منطق، علم اور قانون الہی کے ضوابط کے تحت چلتی ہے۔ یہ اس نام نہاد یا کھوکھلی آزادی کی طرح نہیں ہے جس کا راگ مغرب الایٹا ہے تاکہ اقدار کو پامال کیا جاسکے اور فحاشی و فساد کو پھیلایا جاسکے۔ کیونکہ ایسی کھوکھلی آزادی اس اخلاقِ فاضلہ اور حقیقی انسانیت کے بالکل برعکس ہے جس پر انسان کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

تیسرا پہلو: علمی، ثقافتی شعور اور برہانی (دلائل پر مبنی) منطق کو آشکار کرنا ہے۔ کیونکہ انسان کا فکری سفر اس کے تجربات اور علمی جستجو کے مطابق بتدریج ترقی کی طرف مائل رہتا ہے، وہ کبھی جامد نہیں رہا بشرطیکہ اسے علمی صلاحیتیں اور حسی مبادی (بنیادی اصول) فراہم کیے جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم علمِ اصول کی سب سے پہلی تدوین امام علی (علیہ السلام) کے ہاں پاتے ہیں، جیسا کہ نہج البلاغہ میں اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ قرآن کریم عام و خاص، مطلق و مقید، ناسخ و منسوخ، متشابہ و مجمل، اور مبین جیسی تمام اصطلاحات کو شامل ہے۔ اسی طرح آپ (علیہ السلام) نے ہی علمِ نحو (گرامر) کی پہلی بنیاد اپنے شاگرد (ابو الاسود الدؤلی) کو اس کے موضوعاتی اصول سکھا کر رکھی۔ اور امام حسین (علیہ السلام) اسی وراثت کا مظہر ہیں جو انہوں نے اپنے والدِ گرامی سے حاصل کی، چنانچہ آپ کا یہ کردار امامت کے اسی تسلسل کا ایک حصہ ہے۔

چوہتا پہلو: تہذیبوں کا مقابلہ کرنا اور ایسے ترقی یافتہ نظریات پیش کرنا ہے جن کا قائم ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ کوئی انسان کے فکری اور ذہنی درکات کی تکمیل کا حامل نہ ہو۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ حسینی منطق تمام تہذیبوں کے ہم پلہ ہے اور اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنے برہانی (ثبوتی) اور علمی دلائل کی بدولت تمام فکری ارتقاء کا ساتھ دے سکے۔

کیونکہ یہ حسینی منطق اپنے اندر فکری توانائیوں کو سموئے ہوئے ہے۔ جہاں امام حسین (علیہ السلام) کے نانا، والد اور بھائی نے اجتہاد کا دروازہ کھولا، وہیں آپ خود بھی اجتہاد اور تخلیقی فکر کے اسی نظریے کے علمبردار بنے۔ یہ بات عرفہ کے دن آپ کی دعا اور علوم، فلسفہ اور عرفانی امور پر آپ کی آفاقی نظر سے ثابت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، دوسرے مکاتب فکر نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا، جس کی وجہ سے وہ تہذیبوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ رہے کیونکہ ان کے پاس استنباطی (نتیجہ اخذ کرنے والی) گہرائی نہیں تھی، اگرچہ ان کے پاس تصوری فکر موجود تھی۔ چنانچہ ان دونوں رجحانات کے درمیان واضح فرق ہے۔

پانچواں پہلو: حسینی فکر کا گہرے فلسفیانہ پہلوؤں پر محیط ہونا ہے۔ اس بات کی دلیل یوم عرفہ کی آپ کی وہ دعا ہے جس کے چند فقرے آپ کی شخصیت کے وجود اور آپ کی فکری، علمی اور برہانی گہرائی کو بے نقاب کرنے کے لیے پیش خدمت ہیں، جہاں آپ (علیہ السلام) فرماتے ہیں:

”سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس کے فیصلے کو کوئی ٹال نہیں سکتا، اور جس کی عطا کو کوئی روک نہیں سکتا، اور نہ ہی کوئی بنانے والا اس کی صنعت (کارگیری) جیسی صنعت بنا سکتا ہے۔ وہ وسیع سخاوت والا ہے۔ اس نے مخلوقات کی مختلف اقسام کو پیدا کیا اور اپنی حکمت سے صنعتوں کو محکم (مضبوط) بنایا۔ اس پر کوئی مخفی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے، اور اس کے ہاں امانتیں ضائع نہیں ہوتیں۔ وہ ہر بنانے والے کو جزا دینے والا اور ہر قناعت کرنے والے کو آسودگی دینے والا ہے، وہ عاجزی کرنے والے پر رحم کرنے والا اور فائدے پہنچانے والی کتاب (قرآن) کو چمکتے ہوئے نور کے ساتھ نازل کرنے والا ہے۔ وہ دعاؤں کو سننے والا، سختیوں کو دور کرنے والا، درجات کو بلند کرنے والا اور سرکشوں کو نیست و نابود کرنے والا ہے، پس اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور کوئی چیز اس کے برابر نہیں، اور وہ اس جیسا کوئی نہیں، اور وہی سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔“

دعا کے یہ چند فقرے ہیں جن پر ہم اسی مقدار میں اکتفا کرتے ہیں۔

چنانچہ جب ہم ان علمی نظریات کو اخذ کرنے کی طرف آتے ہیں، تو اس دعا کے ذریعے آپ کئی فلسفیانہ، عرفانی، سماجی، سیاسی، تربیتی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی اصولوں کو چھیڑتے ہوئے نظر آتے ہیں، جہاں کئی نظریات کا تصور قائم کیا جاسکتا ہے۔

پہلا نظریہ:

جو کچھ لفظ ”قضاء“ (فیصلے) کے تحت واقع ہوتا ہے، اس میں علت (وجہ) اور معلول (نتیجے) کا تعلق ایک حتمی امر ہے، جن کے درمیان جدائی ممکن نہیں ہے۔ اور یہ امام علیہ السلام کے اس قول کی وجہ سے ہے: ”جس کے فیصلے کو کوئی ٹال نہیں سکتا“۔

دوسرا نظریہ:

خداوند متعال کی طرف سے فیض اور عطا کی حالت میں، چونکہ وہ ”موجد حقیقی“ (حقیقی وجود دینے والا) ہے، یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی مخلوق خواہ وہ کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو جائے، اس لامتناہی الہی فیض کے آگے رکاوٹ بن سکے۔ چونکہ وہ موجد حقیقی ہے، اس لیے ممکن الوجود (مخلوق) اس عطا کے آگے بند نہیں باندھ سکتا۔ اور یہ امام علیہ السلام کے اس قول کی وجہ سے ہے: ”اور اس کی عطا کو کوئی روک نہیں سکتا“۔ یہاں دفع کرنے والے (الہی طاقت) اور منع کرنے والے (مخلوق کی رکاوٹ) کے درمیان فرق کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ اور یہ کہ ممکن الوجود اپنے اندر ذاتی فقر (محتاجی) رکھتا ہے جبکہ واجب الوجود (اللہ) فنائے مطلق سے پاک ہے۔

تیسرا نظریہ:

اللہ کی کاریگری (صنعت) اور مخلوق کی کاریگری کے درمیان واضح فرق کا پایا جانا ہے۔ کیونکہ اللہ کی کاریگری حقیقی تخلیق اور ایجاد کے محور سے ابھرتی ہے، جبکہ ممکن الوجود (انسان) کی کاریگری تجرباتی ایجادات و انکشافات سے مستنبط ہوتی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو امام علیہ السلام کے اس قول میں واضح ہے: ”اور نہ ہی کوئی بنانے والا اس کی صنعت جیسی صنعت بنا سکتا ہے“۔

چوتھا نظریہ:

خداوند متعال (واجب الوجود) کی ذات کا تقاضا الہی فیض اور مسلسل عطا کی شکل میں ظاہر ہونا ہے جس کے لیے کوئی انقطاع (رکاوٹ یا تسلسل کا ٹوٹنا) نہیں ہے، جبکہ ممکن الوجود (مخلوق) کا افاضہ (فیض پہنچانا) محدود ہوتا ہے۔ اسی نظریے کو امام علیہ السلام نے اپنے اس قول کے ذریعے ظاہر فرمایا ہے: ”وہ وسیع سخاوت والا ہے“۔

پانچواں نظریہ:

اجناس کا ایک دوسرے سے الگ ہونا ان کی انواع اور فصول کے اختلاف کے لحاظ سے ہے۔ یہ نظریہ غیر محدود علم (علم الہی) کو ثابت کرتا ہے، جبکہ اس کے برعکس مخلوقات کا علم محدود ہوتا ہے جو جبلتوں (اندرونی صلاحیتوں) پر قائم ہے۔

جس طرح اجناس اپنی ماہیات (حقیقتوں) کے اعتبار سے تقسیم قبول کرتی ہیں، بالکل اسی طرح اجسام بھی اپنے اجزاء اور ذرات کے لحاظ سے تقسیم اور ٹوٹ پھوٹ (انشطار) کے قابل ہوتے ہیں۔

چھٹا نظریہ:

نتیجہ کو استنباطی پیمانوں (اصولوں) کی طرف لوٹانے کا نظریہ ہے۔ یہ امام علیہ السلام کے اس قول سے اخذ ہوتا ہے: ”اور اپنی حکمت سے صنعتوں کو محکم (مضبوط) بنایا۔“ یہ اس لیے ہے تاکہ اخذ و انتزاع کے مقام پر بنیادی اصولوں کو ان کے نتیجے کے ساتھ جوڑا جاسکے۔

ساتواں نظریہ:

تمام مخلوقات پر علمی احاطہ (کامل واقفیت) کا ہونا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم ”حضورِ علمی“ (ذاتی موجودگی اور شہود) کی بنیاد پر ہے، جو مخلوقات کے علم کے برعکس ہے کیونکہ مخلوقات کا علم ”علمِ حصولی“ (سیکھنے اور حاصل کرنے سے مشروط) ہوتا ہے۔ ان دونوں علوم کے درمیان واضح فرق ہے، اور اللہ کی عالمیت کا تقاضا یہ ہے کہ تمام موجودات کا ظاہر اور باطن اس پر پوشیدہ نہ رہے۔

آٹھواں نظریہ:

خداوند متعال کی ذات کا تمام موجودات پر احاطہ رکھنے اور پوری مخلوق پر نظر رکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ بھی مخلوق کے پاس ہے، وہ سب اس کے علم کے تحت لپٹا ہوا ہے۔ مخلوق اپنی فکری دنیا، اپنے ذہنی و خارجی ذخیرے اور موجودات کی حقیقت کو آشکار کرنے کے معاملے میں خدا کے علم کے تابع ہے۔ پس ارادہ الہی کائنات کی تمام حقیقتوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اور وہ (انسان) اپنی بساط کے مطابق اپنے ملکیت کے خزانوں میں سے جو کچھ بھی جہاں کہیں رکھتا ہے، وہ سب خدا کے علم میں ہے۔ پس وہی ذاتِ باری تعالیٰ ان تمام مخلوقات پر احاطہ رکھنے والی، ان کی نگران اور ان کے وجود کے حدوث (شروع ہونے) اور بقا (قائم رہنے) کے دونوں مراحل میں ان کی حفاظت کرنے والی ہے۔

نواں نظریہ:

خالق اور مخلوق کے درمیان جزا و سزا (مکافاتِ عمل) کو ثابت کرنا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (الصافات: ۳۹)

اور تمہیں جزا نہیں دی جائے گی مگر اسی عمل کی جو تم کرتے تھے۔

اور (دوسری جگہ فرمایا): ”پس جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔“ دنیا کی زندگی میں جزا و سزا کا موضوع اس وقت بنتا ہے جب عمل کرنے والا شہرت اور نام و نمود کا ارادہ رکھتا ہو، جبکہ آخرت کا قصد کرنے کی صورت میں جزا، ثوابِ جنت اور بلند درجات کی شکل میں ملتی ہے۔ جب انسان اپنے عمل کے ذریعے آخرت کا راستہ اختیار کرتا ہے، تو یہ امام علیہ السلام کے اس قول کے مطابق ہوتا ہے: ”ہر بنائے والے کو جزا دینے والا اور ہر قناعت کرنے والے کو آسودگی دینے والا۔“

یہاں لفظ ”رأى“ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ”صانع“ (بنانے والے) کے ہیں، اور اس کی نسبت ہر قناعت کرنے والے کے ساتھ کی گئی ہے اس معنی میں کہ اللہ صانع بھی ہے اور ہر قناعت کرنے والے کا خالق بھی۔ کیونکہ قناعت کرنے والے کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ وہ اس چیز پر اکتفا کرتا ہے جو اس کے پاس موجود ہو، اور وہ مزید کی طرف مائل ہوئے بغیر آگے نظر نہیں رکھتا، اگرچہ اضافی چیز اس کے لیے پسندیدہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہاں لفظ ”رأى“ کا عطف ”صانع“ پر تفسیری عطف ہے، جیسا کہ لغت میں اس کا ذکر آیا ہے۔

دسواں نظریہ:

واجب الوجود (اللہ) کا اپنی مخلوق پر رحمت فرمانا ہے، کیونکہ مخلوق بذاتِ خود کمزور اور محتاج ہے، اور کمزوری کا تقاضا غنی مطلق (ہر چیز سے بے نیاز خدا) سے طلب کرنا ہے۔ اسی بنیاد پر ”الرحمن“ اور ”الرحیم“ کے درمیان فرق واضح ہوتا ہے؛ الرحمن کا مفہوم تمام موجودات کے لیے عام ہے، اور الرحمن سے مراد وہ خاص معنی میں جس کے تحت تمام مخلوقات پر فیض نازل ہوتا ہے۔ جبکہ الرحیم کی صفت دنیا اور آخرت میں بندوں کے لیے رحمت پر نظر رکھتی ہے۔ واجب الوجود کی ذات پر ان دونوں صفات (رحمانیت اور رحیمیت) کا یکجا ہونا کمالِ مطلق کو ثابت کرتا ہے، اور امام علیہ السلام کا یہ فرمان: ”ہر عاجزی کرنے والے پر رحم کرنے والا“ اسی بات کی عکاسی کرتا ہے۔ چونکہ صفتِ رحمانیت تمام انسانوں کے لیے عام ہے، اس لیے ضرورت و احتیاج کے وقت رحمانیت کا تقاضا اس پورے وجود کے قلب (مرکز) پر حاوی ہو جاتا ہے، چنانچہ اس پر عاجزی اور شفقت کا فیض جاری ہوتا ہے۔

گیارہواں نظریہ:

اس شخص کے لیے نفع کو ثابت کرنا ہے جو نفع حاصل کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ مثال کے طور پر، کھیتی بارش سے نفع اٹھاتی ہے، شیر خوار بچہ ماں کے دودھ سے نفع پاتا ہے، اور طالب علم اپنے استاد کے علم سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی طرح یہ منفعت اپنے تقاضوں کے مطابق آگے بڑھتی ہے۔

بارہواں نظریہ:

واجب الوجود (اللہ) کا کائنات کو دیکھنا اس کے علم، ارادے اور قدرت کے لحاظ سے ہے جو کہ ”کتابِ تکوینی جامع“ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے ذریعے تکوینی (تخلیقی) اور تشریعی وجود بکھرتے ہیں، اور یہ وجود بذاتِ خود ایسے نورانی وجود ہیں۔

جو اپنے مقامات اور موضوعات پر چمکتے ہیں، پس ان کے حسن اور روشنی میں اضافہ کرتے ہیں، جس سے وہ کائنات میں ایک طاقت بن کر ابھرتے ہیں، اور یہ عمل الہی فاعلیت اور عطا کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے۔

تیسرہواں نظریہ:

دعا کرنے والے اور دعا قبول کرنے والے (اللہ) کے درمیان تعلق کا ہونا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سائل کی طرف سے آنے والی ہر دعا اور ہر سوال قبول کرنے والے کے پاس سماعت پاتا ہے تاکہ دعا کرنے والے کے لیے انس و سکون کا باعث بنے۔ یہ اس تڑپ اور توجہ کی وجہ سے ہوتا ہے جو دعا کرنے والے میں دیکھی جاتی ہے، چنانچہ خدا کی طرف سے اس پر رضا اور قبولیت کا رخ ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی ظاہری طور پر دعا قبول نہیں ہوتی جس کی وجہ وہ موانع (رکاوٹیں) ہیں جو انسان کے اپنے اندر ہوتے ہیں، جیسا کہ دعا الہی میں ذکر آیا ہے کہ بعض اوقات کئی ایسی رکاوٹیں موجود ہوتی ہیں جن کا دور ہونا ضروری ہے تاکہ دعا حقیقی قبولیت کے مقام تک پہنچ سکے۔^۱

چودہواں نظریہ:

جب انسان مصائب اور بلاؤں میں گھیر جاتا ہے اور خوفناک نقصانات، بپھرے ہوئے طوفانوں اور تباہ کن آفتوں کی وجہ سے شدید مصیبت کا شکار ہو جاتا ہے — خواہ یہ قدرتی اسباب کی وجہ سے ہو یا انسانی زندگی میں آنے والے تباہ کن حادثات کی وجہ سے — تو اس کا بقا اور تحفظ نوعِ انسانی کی رعایت اور مصلحت کے مطابق ایک متحرک عنصر بن جاتا ہے۔ یہ لطفِ الہی کی ایک شکل ہے تاکہ انسان دوبارہ امن، استحکام اور اطمینان کی طرف لوٹ سکے، اور اس بات کا ادراک کر سکے کہ حقیقی موثرِ اعلیٰ صرف اللہ کی ذات ہے۔ یہی ذات ان مصائب کو دور کرنے والی ہے، بلکہ ان کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے ان کا راستہ روکنے والی ہے، جیسے زمین پر ستاروں (شہابِ ثاقب) کے گرنے کو روکنا۔

^۱۔ جہاں دعائے کیل میں اس طرح کی کئی رکاوٹوں (موانع) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پندرہواں نظریہ:

بنی نوع انسان کی تکریم کرنا اور ان کے درجات کو بلند کرنا ہے تاکہ انسان عزت اور رفعت کو محسوس کر سکے۔ اگر انسان اپنی قدر و قیمت کو پہچان کر اس درجے پر فائز ہو جائے، تو وہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو حقارت اور تذلیل کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے اور اپنے اندر دوسروں کے مقابلے میں تکبر اور بڑائی پاتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کے مقام کو دیکھتا ہے جو متکبر کے سامنے عاجزی اختیار کرتا ہے، چنانچہ وہ اسے اہمیت، بلند درجات اور رفعت عطا فرماتا ہے، اور یہ سب بندے کے لیے خدا کی طرف سے اکرام اور محبت کی بنا پر ہوتا ہے۔

سولہواں نظریہ:

فرعونوں، سرکشوں اور جابروں کی تاریخ کا تقاضا یہ ہے کہ جب وہ معاشرے کی گردنوں پر مسلط ہو جاتے ہیں، ان کا رعب و دبدبہ پھیل جاتا ہے، ان کی من مانی چلتی ہے، اور وہ ظلم، قہر اور حقوق سلب کرنے کی حالت کا مظاہرہ کرتے ہیں، تو ایسے حالات میں عدل و انصاف قائم کرنے اور نظام کی حفاظت کے لیے اس ظلم اور سرکشی کو ختم کرنے کی طرف قدم بڑھانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہی وہ صورت حال تھی جو یزید کے دور میں فساد پھیلنے کے وقت رونما ہوئی، چنانچہ یہ لطفِ الہی کا تقاضا تھا کہ ایک انقلابی تحریک کے ذریعے اس ظلم و جور کا خاتمہ کیا جائے جو اس کے اقتدار کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکے اور اس کے جبر و غرور کو مٹا دے۔

سترہواں نظریہ:

حقیقی توحید و یکتائی کی طرف رجوع کرنا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور الہیت (معبود ہونا) صرف اسی کی ذات کے ساتھ خاص ہے نہ کہ کسی اور کے لیے۔ اور جو کوئی بھی الہیت کا دعویٰ کرتا ہے، وہ ان ملکی اور ملکوتی مقامات پر سراسر زیادتی کرتا ہے۔

اٹھارہواں نظریہ:

واجب الوجود کے امور اور ممکن الوجود (مخلوق) کے امور کے درمیان مساوات (برابری) کا نہ ہونا ہے، کیونکہ دونوں کی حقیقتوں میں واضح فرق ہے۔ واجب الوجود کی طرف سے احاطہ تمام مخلوقات پر ہے اور اس کی نظر مطلق ہے، جبکہ جہاں تک ممکن الوجود کا تعلق ہے، تو وہ اپنی طبعی ساخت اور ذات کے لحاظ سے محدود ہے۔ پس ایک لا محدود (خدا) اور محدود (مخلوق) کے درمیان برابری کیسے ممکن ہو سکتی ہے!

انیسواں نظریہ:

واجب الوجود اور ممکن الوجود کے درمیان کسی بھی قسم کی مماثلت (مثلیت) کی نفی کرنا ہے۔ کیونکہ واجب الوجود اپنے اندر جو سادگی و بساطت رکھتا ہے وہ خارج میں بھی ہے اور ذہن میں بھی، اور وہ تقسیم ہونے کے قابل نہیں ہے۔ اس لیے اس کا کوئی ضد، کوئی مثل اور کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کے برعکس ممکن الوجود کا معاملہ ہے، کیونکہ وہ مماثلت، مشابہت اور مثال لائے جانے کے تابع ہے، اور وہ ذہن اور خارج دونوں میں تقسیم اور ٹکڑے ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پس مماثلت کا موضوع یا تو جنس میں منطبق ہوتا ہے، یا نوع میں، یا مصداق میں؛ اور ان میں سے کوئی بھی چیز واجب الوجود پر لاگو نہیں ہوتی۔

بیسواں نظریہ:

واجب الوجود کی ذات کا سننا اور دیکھنا اس کا ذاتی تقاضا ہے، جس کے تحت وہ ہر اس چیز پر تسلط اور قدرت رکھتا ہے جو ممکن الوجود سے صادر ہوتی ہے، خواہ اس کا تعلق نباتات کی صنف سے ہو، حیوانات سے ہو یا انسان سے۔ پس وہ پاک ذات ہر اس آواز کو سنتی ہے جو کسی صورت کی شکل میں نکلتی ہے یا فضا میں ارتعاش اور لہروں کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ پاک ذات تمام موجودات کو ان کی اجناس، فصول اور فریکوئنسی (ترددات) کے اختلاف کے باوجود دیکھتی اور سنتی ہے۔

دوسرا پہلو: آپ (علیہ السلام) کے سیاسی مدرسے (فلسفے) کا اثبات

ہے

جہاں سے امام حسین (علیہ السلام) کا سیاسی مدرسہ کئی محوروں کی صورت میں پھوٹتا ہے۔ یہاں ہم ان میں سے چند نکات پیش کرتے ہیں جن پر امام حسین (علیہ السلام) کا مزن رہے:

۱۔ غزوہ قسطنطنیہ میں امام حسین (علیہ السلام) کی شرکت:

آپ نے سن ۵۱ ہجری (۶۷۱ عیسوی) میں بعض جلیل القدر صحابہ جیسے عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، ابوالیوب الانصاری اور سفیان بن عوف الغامدی کے ساتھ اس غزوے میں شرکت فرمائی۔ اگرچہ یہ غزوہ خراب موسمی حالات اور اسلامی لشکر میں بیماری پھیلنے کی وجہ سے مطلوبہ مقاصد حاصل نہ کر سکا، اور یہ بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ مزید بھی اس لشکر کے ساتھ گیا تھا لیکن وہ اپنی شہوات اور عیاشیوں میں مشغول رہا۔^۱

^۱ تاریخ یعقوبی، جلد ۲، صفحہ ۵۹؛ اور اسی طرح کتاب "غصن الرسول"، صفحہ ۶۹-۷۰۔

یزید کے لیے بیعت لینے پر امام حسین (علیہ السلام) کی مخالفت:

جب امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کے لیے بیعت لینے کی کوشش کی تو امام حسین (علیہ السلام) نے اس کی سخت مخالفت فرمائی۔^۱

لیکن معاویہ طاقت کے بل بوتے پر بھی امام حسین (علیہ السلام) سے یزید کی بیعت لینے میں ناکام رہا، باوجود اس کے کہ معاویہ نے مدینہ کے اپنے سفر کے دوران اس بات کی بھرپور کوشش کی تھی کہ اپنا نقطہ نظر پیش کرے۔ تاہم امام حسین (علیہ السلام) کا موقف واضح تھا کہ یزید کے ساتھ کسی قسم کا عہد و پیمان یا خاموشی کا معاہدہ نہیں کیا جاسکتا، اور نہ ہی اس کے کوئی مثبت نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔

۲- موسم حج میں امام حسین (علیہ السلام) کا اکابرین کے ساتھ اجتماع:

امیر معاویہ کی وفات کے بعد، امام حسین (علیہ السلام) نے حج کے موقع پر نامور شخصیات کے ساتھ ایک بڑا اجتماع کیا اور معاویہ اور اس کے بیٹے یزید کے کرتوتوں اور فساد کو بے نقاب کیا۔ آپ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: ”اما بعد، اس سرکش (طاغیہ) نے ہمارے اور ہمارے شیعوں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ آپ سب کے علم میں ہے اور آپ اس کے گواہ ہیں۔ میں آپ سے کچھ باتوں کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں، اگر میں سچ کہوں تو میری تصدیق کریں، اور اگر میں جھوٹ بولوں تو مجھے جھٹلا دیں۔ میری بات کو سنیں اور میری گفتگو کو محفوظ رکھیں، پھر جب آپ اپنے شہروں اور قبیلوں میں واپس جائیں، تو جن پر آپ کو بھروسہ ہو اور جنہیں امین سمجھیں، انہیں ان باتوں کی دعوت دیں جن کا آپ کو علم ہے، کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ حق مٹ نہ جائے اور مغلوب نہ ہو جائے، حالانکہ اللہ اپنے نور کو پورا کرنے والا ہے خواہ کافروں کو ناگوار ہی کیوں نہ گزرے۔“^۲

۳- یزید کا مدینہ کے گورنر کے ذریعے زبردستی بیعت لینے کا اقدام:

یزید نے مدینہ کے گورنر ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کو طاقت اور دھمکی آمیز انداز میں بیعت لینے کا حکم دیا۔ اس نے اپنے خط میں لکھا: ”جب میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے، تو حسین بن علی اور عبد اللہ بن زبیر کو حاضر کرو اور ان دونوں سے میری بیعت لو۔ اگر وہ انکار کریں تو ان کی گردنیں اڑا دو اور ان کے سر میرے پاس بھیج دو، اور لوگوں سے بیعت لو، اور جو انکار کرے اس پر میرا حکم نافذ کرو۔ والسلام، حسین بن علی اور عبد اللہ بن زبیر کے بارے میں خاص طور پر سختی کرنا۔“^۳

^۱- اور اسی طرح ابن قتیبہ الدینوری کی کتاب ”الایمان والسیاسة“، صفحہ ۲۲۷۔

^۲- الاحتجاج للطبرسی، جلد ۲، صفحہ ۸۷۔

^۳- تاریخ یعقوبی، جلد ۲، صفحہ ۱۶۸۔

۴- امام حسین (علیہ السلام) کی بیعت سے مخالفت اور گورنر کو آپ کا جواب:

امام حسین (علیہ السلام) نے بیعت کی مخالفت کی اور گورنر (ولید) کو یہ جواب دیا: ”مجھ جیسا شخص خفیہ طور پر بیعت نہیں کر سکتا، اور میں نہیں سمجھتا کہ تم مجھ سے خفیہ بیعت لینے پر اکتفا کرو گے جب تک کہ تم اسے لوگوں کے سامنے اعلانیہ طور پر پیش نہ کرو۔“ گورنر نے کہا: ”جی ہاں۔“ آپ نے فرمایا: ”پس جب تم صبح لوگوں کے پاس نکلتا اور انہیں بیعت کی دعوت دینا، تو ان کے ساتھ ہمیں بھی دعوت دے دینا، یوں یہ سارا معاملہ ایک ساتھ (سب کے سامنے) ہو جائے گا۔“^۱

اور جب امام حسین (علیہ السلام) نے وہاں سے واپس جانے کا ارادہ کیا، تو گورنر کے پاس موجود مروان بن الحکم کو غصہ آ گیا اور اس نے گورنر سے کہا: ”اگر یہ اس وقت تمہارے پاس سے جدا ہو گئے اور انہوں نے بیعت نہ کی، تو تم پھر کبھی ان پر قابو نہیں پاسکو گے یہاں تک کہ تمہارے اور ان کے درمیان بہت زیادہ خونریزی ہو جائے۔ اس مرد کو یہیں قید کر لو اور یہ یہاں سے نہ نکلنے پائے جب تک کہ یہ بیعت نہ کر لے یا تم اس کی گردن اڑا دو۔“^۲

چنانچہ زید کے خلاف امام حسین (علیہ السلام) کے خروج (قیام) کا جواز اس مکمل صلح نامے سے واضح ہو جاتا ہے جو امام حسن (علیہ السلام) اور معاویہ کے درمیان طے پایا تھا، اور معاویہ کی طرف سے اس صلح کی پاسداری نہ کرنا ہی اس عہد و پیمان کے ٹوٹنے کا سبب بنا۔

۵- وہ اسباب جو زید کے فساد اور ظلم کے اظہار کی وجہ سے اس کے خلاف قیام کو واجب کرتے ہیں۔
منجملہ (ان میں سے ایک پہلو): ابلاغی و تشہیری (میڈیا) کردار ہے: یہ تمام علاقائی اور دیگر شعبوں میں تحریک پیدا کرنے کی صورت میں تھا، جیسے آپ کی طرف سے بصرہ کی طرف و فود کا بھیجا جانا، اور اپنے ذاتی، سماجی اور سیاسی کردار کو آشکار کرنا، اور اپنی تحریک کے ذریعے اس بات کو ثابت کرنا کہ:

آپ ہی شرعی وارث ہیں اور امامت ایک الہی منصوبہ ہے جس کا نگران کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

دوسرا پہلو: اس تحریک کے لیے تاریخی تسلسل کو ثابت کرنا ہے: یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کا یہ سفر انبیاء اور اولیاء کے اسی راستے کا تسلسل ہے جو انہوں نے مظلوموں کے حقوق کے دفاع میں طے کیا؛ جیسے بنی اسرائیل سے ظلم کو دور کرنے کے لیے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا قیام، بے کسوں اور مسکینوں کے دفاع اور توحید و عدل الہی کو ثابت کرنے کے لیے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا قیام، اور قریش کے سرداروں کی سرکشی کے خلاف اور جزیرہ نمائے عرب میں پھیلے شرک و گمراہی کو مٹانے کے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا قیام۔ چنانچہ امام حسین (علیہ السلام) کا یہ سفر

۱- المختصر لابن الجوزی، جلد ۵، صفحہ ۳۲۳۔

۲- الطبری فی تاریخہ، جلد ۳، صفحہ ۷۰۔

السلام) کی تحریک انبیاء اور اولیاء کی تحریکوں سے پھوٹنے والی اسی ایمانی صفت کے اظہار کا ایک مرحلہ ہے، اور اسی بنیاد پر امام حسین (علیہ السلام) کا قیام تحریک نبوی کا حقیقی عکس بن کر سامنے آتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو حرکت نبوت اور مسیرت امامت کے درمیان ایک وجودی وحدت (اتحاد) کو ثابت کرتی ہے۔

تیسرا پہلو: پیغام رسالت کی ترویج میں عورت کی اہلیت، اس کے جہاد اور اس کی معاونت کو ثابت کرنا ہے: امام حسین (علیہ السلام) کے انقلاب کے سفر میں عورت کو شامل کرنا اور اسے اس جہادی تحریک میں ذمہ داری کا کردار سونپنا اس درجے پر تھا کہ اموی سلطنت کا یہ ڈھانچہ گرنے ہی والا تھا، اگر مدینہ کے گورنر کلید زید کو وہ خط نہ پہنچتا جس میں اس نے ان ابعاد کو آشکار کیا تھا۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جسے سیدہ طاہرہ زینب بنت علی (علیہ السلام) نے امام حسین (علیہ السلام) کے انقلاب کے واقعات کے دوران اپنے بھائی کی نصرت و حمایت کر کے ثابت کیا۔ آپ (سیدہ زینب) اس انقلاب کے باقی رہنے کی ”علت“ (وجہ) بنیں، بالکل اسی طرح جیسے امام حسین (علیہ السلام) اس مہم کو شروع کرنے کی علت بنے تھے۔

چوتھا پہلو: انصار (ساتھیوں) کے درمیان سماجی اتحاد ہے: یہ ایک ایسا پہلو ہے جس نے علمائے اجتماع (سوشلو جسٹس) کو چونکا دیا، کیونکہ امام حسین (علیہ السلام) نے مختلف نسلوں، مختلف عقائد اور مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے گروہوں کو یکجا کر دیا تھا۔ ان کے انقلاب کا یہ خاکہ مقصد اور منزل کی یکسانیت، اور اصول و اقدار اور فضیلت کی بلندی پر قائم تھا، جس کی وجہ سے ان کی قیادت کے درمیان کسی قسم کا کوئی تفرقہ یا ذاتی جھکاؤ موجود نہیں تھا۔ کیونکہ ان کا ہر ایک جانثار اس مقصد اور منزل کو برقرار رکھنے کے لیے خود پر دوسروں کو ترجیح (ایثار) دے رہا تھا، چنانچہ سب کے سب اس مطلوبہ ہدف کو ثابت کرنے کے لیے موت کا استقبال کر رہے تھے۔

چنانچہ جب کوئی کربلا کے واقعے کا گہرا مطالعہ کرتا ہے، تو وہ پاتا ہے کہ امام حسین (علیہ السلام) نے اپنے انصار و ساتھیوں کے ساتھ اپنے تربیتی، سماجی اور اخلاقی سلوک میں ہر ایک کو اس کے مرتبے کے مطابق مقام دیا۔ مثال کے طور پر، جب حر (بن زید ریاحی) امام حسین (علیہ السلام) کے پاس توبہ اور ندامت کا اظہار کرتے ہوئے آئے، تو آپ نے ان کی معذرت کو قبول فرمایا اور ارشاد کیا: ”اگر تم توبہ کر لو تو اللہ تمہاری توبہ قبول فرمائے گا۔“ آپ نے لوگوں کی توبہ کی قبولیت کو مشروط رکھا کہ جب توبہ اور ندامت حقیقی ہو، تو اللہ اس سے راضی ہوتا ہے۔

اسی طرح جب جون — جو کہ ایک (سیاہ فام) غلام تھے — شہید ہوئے، تو امام حسین (علیہ السلام) نے اپنا رخسار مبارک جون کے رخسار پر رکھ دیا۔ یہ عمل امام اور رعایا کے درمیان اخلاقی تواضع اور عاجزی کی بہترین دلیل ہے۔ یا جس طرح آپ نے حبیب بن مظاہر اسدی کو فوج کا علم (پرچم) عطا کیا، یہ ان کی قیادت اور صحابیت کی اہلیت کی بنا پر تھا کیونکہ وہ مقام

ولایت کی معرفت میں ایک بلند مرتبے پر فائز تھے، اور یہ عسکری قیادت میں ان کی صلاحیتوں کے اظہار کی ایک واضح دلیل ہے۔